اقبال کا نظریہ خودی
اسرار خودی کی روشنی میں

ڈاکٹر عبدالمغنی

فلسفہ اقبال کے آب وگل میں تھا اور اس کے اسرار ورموز ان کے ریشہ ہائے دل میں پوشیدہ تھے، جیسا انھوں نے خود ضرب کلیم کی ایک نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' میں اقرار کیا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی رگ رگ سے باخبر تھے، لیکن اسی واقفیت کے سبب وہ یہ بھی جانتے تھے کہ:

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

وہ سمجھتے تھے کے فلسفیوں کا صدف گہر سے خالی ہے اور خرد کے بدلتے ہوئے نظریات کا طلسم سب کا سب خیالی ہے۔ اقبال کو فکر تھی:

محکم کیسے ہو زندگانی؟ کس طرح خودی ہو لازمانی؟

اس لیے کہ اپنے زمانے کے انتشار و پراگندگی کو دیکھتے ہوئے اقبال شدت سے محسوس کرتے تھے:

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

تا کہ اس دستور کی روشنی میں عصر حاضر کی شب تاریک دور ہو اور ایک بہتر دورِ انسانیت کی نئی سحر طلوع ہو سکے:

دنیا کی عشا ہو جس سے اِشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

اس انقلاب انگیز اور عہد آفریں نصب العین کے حصول کے لیے اقبال کا نقطۂ نظر تھا:

دیں مسلک زندگی کی تقویم دیں سرِّ محمدؐ و براہیمؑ

لیکن مشکل یہ تھی کہ

ہند میں حکمت دیں کوئی، کہاں سے سیکھے نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(اجتہاد۔ضرب کلیم)

غلامی کے طریق پر ضرب لگا کر اہل وطن، برادرانِ ملت اور دنیائے انسانیت کو عام حریت کا پیغام دینے کے لیے اقبال نے اپنے وقت اور ماحول کے لحاظ سے بہترین وسیلۂ اظہار شاعری کو تصور کیا، اس لیے کہ وہ قلب مروہ کی بیداری کا سامان کرتی ہے:

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخن وری

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

(شاعر(۲)۔بانگ درا)

اقبال کی نگاہ میں ''شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم'' (شاعر۔ بانگ درا) یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے نظریۂ خودی کے موثر ابلاغ کے لیے سخن وری کی راہ اختیار کی، گرچہ انھیں احساس تھا کہ شاید ابھی وہ نسل پیدا نہیں ہوئی ہے جو اقبال کی بانگ درا کو بال جبریل اور ضرب کلیم بنا کر فکر و عمل کے وہ کارنامے انجام دے جو ان کے آفاقی مطمح نظر کے حصول کا باعث ہوں۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنا پیام مشرق دنیا کو دیا اور انسانیت کے لیے ایک زبور عجم تصنیف کی، تاکہ زندگی جاوید نامہ کی منزلِ ارتقا تک پہنچ سکے۔

اقبال بیرسٹری کی سند کے ساتھ ساتھ فلسفۂ عجم لکھ کر اور اس پر فلسفے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے مغرب کے تعلیمی سفر سے ہندوستان لوٹے تو ان کا دماغ جدید وجدید خیالات سے بھرا ہوا تھا، وہ یورپ میں ترقی کے ساتھ ساتھ زوال کے آثار دیکھ چکے تھے اور سمجھتے تھے کہ آج کی انسانیت کے امراض

کے علاج کا نسخہ مغرب کے پاس نہیں ہے بلکہ وہ خود مریض اور مرض دونوں بن گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کر لے۔ چنانچہ بہت جلد دنیا کا افق پہلی جنگ عظیم کے مہیب بادلوں سے تاریک ہو گیا۔۱۹۱۴ء میں عام تباہی کی بارش شروع ہو گئی۔ اسی عالم میں اقبال کی فارسی مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ ایک طرف اقبال اپنے زور کلام کی تاثیر سے واقف تھے:

باغباں زور کلامم آزمود
مصرعے کارید و شمشیرے درود

لیکن دوسری طرف انھیں یہ احساس بھی تھا:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعر فرداستم
عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہر ایں بازار نیست

ان کا خیال تھا:

نغمۂ من از جہان دیگر است　　ایں جرس را کاروان دیگر است

مطلب یہ کہ اقبال کے ایک ایک مصرعے میں شمشیر کی کاٹ ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ ان کے نغمے کو سننے والی محفل موجود نہیں، لہٰذا وہ ''شاعر فردا'' ہیں اور مستقبل کے لیے لکھ رہے ہیں، جب کہ عصر حاضر اسرارِ حیات سے واقف نہیں، چنانچہ ان کا نغمہ جس طرح ایک جہانِ دیگر سے آ رہا ہے اسی طرح یہ ایک کاروانِ دیگر کے لیے جرس بھی ثابت ہوگا۔ اس یقین واعتماد کے ساتھ وہ اپنے قارئین کو دعوت دیتے ہیں:

سرِّ عیش جاوداں خواہی بیا　　ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا
شعلۂ آبے کہ اصلش زمزم است　　گر گدا باشد پرستارش جم است
می کند اندیشہ را ہشیار تر　　دیدۂ بیدار را بیدار تر
اعتبارِ کوہ بخشد کاہ را　　قوت شیراں دہد روباہ را
خاک را اوج ثریا می دہد　　قطرہ را پہنائے دریا می دہد

مفہوم یہ ہے کہ اگر تم عیش جاوداں اور دولت زمین وآسماں چاہتے ہو تو اس کلام کا مطالعہ کرو، یہ ایک ایسے پانی کا شعلہ ہے جس کا سوتا زمزم سے پھوٹ رہا ہے، جو اسے پی لے اگر وہ گدا بھی ہو تو شاہانِ وقت اس کی غلامی کریں گے، اس سے عقل تیز تر اور چشم بنیا بیدار تر ہوتی ہے، یہ تنکے کو پہاڑ کی قوت بخشتا ہے اور لومڑی کو شیر بنا دیتا ہے، اس کے ذریعے خاک اوجِ ثریا پر پہنچ جاتی ہے اور قطرہ دریا کی وسعت اختیار کر

لیتا ہے۔ایسے طاقت ورکلام کا مقصد یہ ہے کہ

تا سوے منزل کشم آوارہ را ذوق بیتابی دہم نظارہ را
گرم رو از جستجوئے نو شوم روشناس آرزوے نو شوم

یعنی یہ نغمہ سرائی بھٹکے ہوؤں کو نہ صرف منزل کا پتا دے گی بلکہ انھیں اس کی طرف گام زن کر دے گی، نتیجتاً وہ جلوۂ مقصود کے لیے بے تاب ہو کر ایک نئی جستجو سے سرشار ہوں گے اور ایک نئی آرزو انھیں پیہم سرگرم سفر رکھے گی۔

بہر حال، اس زبردست زمزمہ پردازی کا مقصد فقط شاعری نہیں ہے:

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

اس کا محرک انسانیت کی بہتری کے لیے شاعر کا گریۂ شب ہے، جس کے سبب اسرارِ زیست اس پر کھل گئے اور اس نے دنیائے ممکنات کے باطن سے تقویم حیات کا عطر نکال لیا:

بہر انسان چشم من شب ہا گریست
تا دریدم پردہ اسرار زیست
از دردن کار گاہ ممکنات
برکشیدم سر تقویم حیات

خودی کی اہمیت وعظمت

اقبال کا پیغام حیات 'خودی' اپنے وسیع ترین معنوں میں ہے۔اس کی بنیاد خدا کی ذات ہے، جو خودی کی تمام جہتوں کا منبع ہے۔ چنانچہ تمہیدی اشعار کے بعد موضوع بحث کا پہلا ہی باب خودی کو نظامِ عالم کی اصل کے طور پر پیش کرتا ہے، ساتھ ہی واضح کرتا ہے کہ حیات کا تسلسل اور وجود کا تعین استحکام خودی پر منحصر ہے۔ لہٰذا انسان کو خودی کی اس اہمیت وعظمت کا احساس کر کے اس سے بصیرت حاصل کرنی چاہیے۔ اس بیان میں بہت ہی شاعرانہ انداز سے متعدد تشبیہات واستعارات کے ذریعے آغاز کائنات اور ابتدائے حیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اس اشارے سے دنیا کی حقیقت اور زندگی کی واقعیت آشکار ہوتی ہے۔ ایک شعر ہے:

صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیداست از اثبات او

یہ خدا کی مطلق خودی کے تخلیقی محرکات وکمالات کا نغمہ ہے۔اس میں فطرت کے مظاہر سے انسان کی

تخلیق تک کے اشارات مضمر ہیں۔حسب ذیل شعر مقصد کائنات کی نشاندہی کرتا ہے:

شعلہ ہائے او صد ابراہیمؑ سوخت تا چراغ یک محمد بر فروخت

یہ بحیثیت واحد آفاقی دین انسانیت کے اسلام کے ارتقا کا استعاراتی بیان ہے۔حضرت آدمؑ سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے حضرت محمدؐ تک ایک ہی نظریہ حیات اور نظام زندگی کا فروغ مرحلہ بہ مرحلہ ایک تدریج وترتیب کے ساتھ ہوا جس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی امتیاز یہ ہے کہ وہ ختم الرسل ہیں اوران کی شریعت دین اسلام کی تکمیل کرتی ہے۔

بہرحال، خدا کی خودی کی کوئی حد نہیں ہے اور وہ ہر تعین سے ماورا ہے:

وسعتِ ایام جولاں گاہِ او آسماں موجے زگرد راہِ او

انسان کی محدود عقل کے لیے اس مطلق خودی کا تصور آسان نہیں، اس لیے کہ اسے جو عقل دی گئی ہے وہ جز پرست ہے اوراس کے لیے کل کا اندازہ کرنا مشکل ہے:

شعلۂ خود در شرر تقسیم کرد جز پرستی عقل را تعلیم کرد

فکر انسانی کی یہ نارسائی اسی وقت دور ہوسکتی ہے جب وہ مجرد فلسفہ آرائی کی بجائے خودی کے عملی پہلو پر نظر ڈالے:

قوت خاموش و بے تاب عمل
از عمل پابند اسباب عمل

خودی کی ذات کا ظہور جب عملاً کائنات میں ہوتا ہے تو وہ ایک نظام اسباب پر مبنی ہوتا ہے، جس کا مطالعہ کرکے انسان ہستی کے حقائق کا سراغ لگا سکتا ہے۔ عالم کا ذرّہ ذرّہ خدا کی خودی کا شاہد ہے، ذات خداوندی کا نشان ہے، جمال ازل کا آئینہ ہے۔خودی کی اس آفاقیت کا علم بجائے خود ایک طاقت ہے۔ اس سے حقائق کا عرفان حاصل ہوتا ہے او بہت بڑے پیمانے پر عمل کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔کائنات کی اس بنیادی صداقت سے انسان کو کچھ سبق لینا چاہیے:

قطرہ چوں حرفِ خودی از برکند ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند
سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت ہمت او سینۂ گلشن شگافت
چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است ماہ پابند طواف پیہم است
ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است پس زمیں مسحور چشم خاور است

قطرے کے اندر خودی پیدا ہوتی ہے تو وہ موتی بن جاتا ہے، سبزہ جب اپنے اندر اُگنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے تو اس کی ہمت زمین گلشن کا سینہ چاک کر دیتی ہے، زمین چونکہ اپنی ہستی میں محکم ہے لہٰذا

ماہتاب اس کے گرد طواف کر رہا ہے، مگر آفتاب کی ہستی زمین سے زیادہ بھی محکم ہے اور وہ اس کی طاقت سے مسحور ہو کر اس کے گرد ناچ رہی ہے۔

خودی کے مقاصد

خودی محض ایک فلسفیانہ یا صوفیانہ تصور نہیں ہے۔ اس کے کچھ مقاصد ہیں جن کے لیے یہ حرکت میں آتی اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہے۔ مقصد کے لیے آرزو شرط ہے۔ تمنا ہی دراصل کسی چیز کا ارادہ کرتی ہے اور پھر اسے حاصل کر لیتی ہے۔ کوشش خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کا سارا کارخانہ اور کارنامہ عزائم کا مرہون منت ہے۔ عقل، علم، عمل سب آرزو کی دین ہیں اور ان سب کا مقصود زندگی کا تحفظ اور اس کی ترقی ہے۔ اس تحفظ و ترقی سے خودی باقی بھی رہتی ہے اور اس کا فروغ و عروج بھی ہوتا ہے۔ حیات کا ارتقا خودی کے اس عملی اظہار سے وابستہ ہے جس سے مقاصد کی تخلیق و تکمیل ہوتی ہے:

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت — بلبل از سعیٔ نوا منقار یافت
زندگی سرمایہ دار از آرزوست — عقل از زائیدگان بطن اوست
علم از سامانِ حفظ زندگی است — علم از اسباب تقویم خودی است

زندگی کی بقا مدّعا سے ہے۔ کاروانِ حیات جرس مدعا کی آواز پر منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ زندگی جستجو میں پوشیدہ ہے۔ اس کی اصل آرزو ہے۔ کوشش رفتار نے فاختہ کو خرام اور سعی نوا نے بلبل کو نغمہ عطا کیا۔ زندگی کا سارا سرمایہ آرزو کا بخشا ہوا ہے۔ عقل بھی تمنا ہی کی مخلوق ہے۔ علم زندگی کی حفاظت اور خودی کے استحکام کے لیے ہے۔

لہٰذا انسان کو، جو عصر حاضر میں رازِ حیات گم کر چکا ہے، شراب مقصد سے مست ہو کر اٹھنا اور راہِ ارتقا میں قدم آگے بڑھانا چاہیے۔ ہماری زندگی تخلیق مقاصد پر منحصر ہے اور ہماری ساری آب و تاب شعاع آرزو دہی کے طفیل ہے:

اے ز راز زندگی بیگانہ خیز — از شراب مقصدے مستانہ خیز
ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاع آرزو تابندہ ایم

خودی اور عشق

اس باب میں سب سے پہلے چند اشعار میں بتایا گیا ہے کہ عشق و محبت سے خودی استحکام حاصل کرتی

ہے۔ یہ ایک اصولی نکتہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس اصول پر عمل کیسے ہو؟ اقبال ہمیشہ افکار کے عملی پہلو کو سامنے رکھتے ہیں، اس لیے کہ مجرد فلسفہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ لہٰذا انسان کے لیے خدا کی محبت کو ایک اصول قرار دے کر شاعر نے اس پر عمل کے سلسلے میں پورا زور عشق رسولؐ پر دیا ہے اور اس میں محض محبت کے دعوے سے آگے بڑھ کر رسول خدا کے مکمل اتباع و تقلید پر تاکیدی نشان لگایا ہے۔ اس مقصد کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے علاوہ سیرت کے چند اہم واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس لیے کہ ان ہی حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے اسوۂ حسنہ کی کیا اہمیت وافادیت بنی نوع انسان کے ہر فرد اور معاشرے کے لیے ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہؐ کے جن اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں تفکر، دردمندی، مساوات، حریت، اخوت، عدل، شجاعت، رحمت فیاضی و رواداری سب سے نمایاں ہیں:

از محبت می شود پاینده تر　　زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر
از نگاه عشق خارا شق بود　　عشق حق آخر سراپا حق بود
هست معشوقے نهاں اندر دلت　　چشم اگر داری بیا بنمائمت

خودی محبت سے پائندہ ہوتی ہے۔ عشق چٹان کو بھی توڑ دیتا ہے۔ حق تعالیٰ کا عشق انسان کو سراپا حق بنا دیتا ہے۔ معشوق حقیقی کا خیال ہر آدمی کے قلب میں جاگزیں ہے اور اس کا ضمیر اپنے رب کے وجود کی گواہی دیتا ہے۔ دل اپنے آپ، بالکل فطری طور سے رب کی محبت کی طرف کھینچتا ہے۔ یہ بیان گویا تفسیر ہے الست بربکم قالوا بلیٰ کی (روز ازل خدا نے تمام انسانوں کی ارواح سے سوال کیا۔ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' سب نے کہا، ''ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں''۔ آیت قرآنی) اور تخلقوا باخلاق اللّٰہ (اپنے اندر صفات الٰہیہ کے خواص پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ حدیث رسول) کی۔ اس کے بعد عشق و محبت کے معاملے میں مقام مصطفیٰ کی وضاحت کی جاتی ہے:

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است　　آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است
در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید
در نگاه او یکے بالا و پست　　با غلام خویش بر یک خواں نشست
آں که بر اعدا درِ رحمت کشاد　　مکه را پیغام لا تثریب داد
کیفیت ها خیزد از صهبائے عشق　　هست هم تقلید از اسمائے عشق

مقام مصطفیٰ ہر مومن و مسلم کے دل میں ہے۔ ملت مسلمہ کی آبرو نام مصطفیٰ سے ہی ہے۔ حضورؐ نے غار حرا میں ذکر و فکر کے بعد وحی الٰہی کے تحت ایک امت اور ایک آئین کی تشکیل کی، جس کی بدولت دنیا کی

سب سے بڑی اور اچھی حکومت تاریخ کے پردے پر ظاہر ہوئی۔ رسولؐ کی ایک نگاہ نے بلند و پست کو برابر کر دیا اور آپ نے خود اپنے غلام کے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھایا۔ آپ نے دشمنوں پر بھی رحمت کے دروازے کھول دیے، عین فتح مکہ کے موقع پر سارے مخالفوں کو معاف کر دیا اور ان کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آئے۔ بہرحال، عشق رسولؐ کا مطلب اسوۂ رسول کی تقلید و اتباع ہے۔ اس میں قرآن کی دوسری آیات کے ساتھ خاص اس آیت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ (اے محمدؐ! لوگوں سے کہیے، اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، تب اللہ تم سے محبت کرے گا)۔ رسولؐ کا کردار ایک نمونۂ عمل ہے: لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ۔ (قرآن)

اس طرح خدا کا عشق رسولؐ کے اتباع سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی اتباع سے ملت اسلامیہ کی آفاقی برادری پیدا ہوتی ہے۔ یہ برادری ایک عالم گیر نظام عدل قائم کرتی ہے۔ اس کا متحد عمل ایک ایسی شریعت پر ہوتا ہے جو دین کی کلید سے دنیا کے تمام مسائل کا قفل کھول دیتی ہے۔ جب امت مسلمہ پورے خلوص کے ساتھ شریعت و سیرت پر کاربند ہوتی ہے تو روئے زمین پر نیابت الٰہی کا حق ادا کرتی ہے اور دنیا میں ہر قسم کی ترقی اسی کے زیر اقتدار ہوتی ہے:

از کلید دیں در دنیا کشاد ہمچو او بطن ام گیتی نزاد
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا شرح اِنّی جَاعِلٌ سازد ترا

یعنی رسول اللہؐ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اگر ان کے پیرو بھی قرآن کے لفظوں میں باہم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار (کانھم بنیانٌ مرصوص) بن کر ایک لشکر عشق ترتیب دیں اور باطل کے خلاف جہاد کریں تو دنیا ان کے قدموں میں ہوگی اور وہ اس کی تزئین و ترقی کے مواقع، اختیارات اور وسائل حاصل کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ایک طرف رسول کی کیفیت یہ ہے کہ:

ماند شب ہا چشم او محروم نوم تا بہ تخت خسروی خوابید قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز دیدۂ او اشک بار اندر نماز
در دعائے نصرت آمیں تیغ او قاطع نسل سلاطیں تیغ او

کتنی ہی راتیں اللہ کے رسولؐ نے عبادت میں جاگ کر گزاریں، تب ان کی قوم اس قابل ہوئی کہ تخت خسروی اس کے قدموں تلے روندا گیا۔ گرچہ رسولؐ کی تیغ میدانِ کارزار میں فولاد کو توڑ سکتی تھی، مگر ان کی آنکھیں عین لڑائی میں بھی نماز کے اندر اشک بار ہوتی تھیں، جب اللہ کے مٹھی بھر بے سروسامان سپاہی بدر کے میدان میں اپنے سے بہت بڑے اور نہایت مسلح لشکر کفار کا مقابلہ کر رہے تھے اور خود رسول اللہؐ اسلحہ بند ہو کر اس جنگ کی قیادت مسلمانوں کی جانب سے کر رہے تھے، دنیا کے اس سپہ سالارِ اعظمؐ کا سر

سجدے میں جھکا ہوا تھا اور وہ خدا سے لشکر حق کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔ ان دعاؤں پر امین کہنے والی خود اس کی شمشیر تھی جس کا جوہر اس کے پیرو میدانِ عمل میں دکھا رہے تھے۔ عبادت الٰہی کے ساتھ ساتھ اس عمل دنیا ہی کا انعام دربار خداوندی سے یہ ملا کہ ملوکیت کی جڑیں کٹ گئیں اور خلافت کا علم دنیا میں لہرانے لگا۔ دوسری طرف جس ملت کے ہاتھوں میں یہ علَم تھا اس کی حقیقت یہ ہے:

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما شبنم یک صبح خندانیم ما
چوں گل صد برگ ما را بو یکے ست اوست جانِ ایں نظام و او یکے ست

ہم قید وطن سے بیگانہ ہیں، جس طرح دو آنکھوں کا نور ایک ہی ہوتا ہے اسی طرح مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کی روح ایک ہی ہے۔ ہم حجاز میں بھی ہیں، چین میں بھی، ایران میں بھی، لیکن ہم سب مل کر ایک ہی ہنستی ہوئی صبح میں پھولوں پر گرنے والی شبنم کی طرح یکساں ہیں اور ہماری مثال گلاب کی پنکھڑیوں کی ہے جن کی خوشبو ایک ہی ہوتی ہے۔ رسول خداؐ ملت اسلامیہ کے پورے نظام کی جان ہیں وہ ایک ہی ہیں، لہٰذا ملت کے تمام افراد بھی کروڑوں قالبوں میں یک جان ہیں: واعتصموا بحبل اللّٰہ جمعیا و لا تفرقوا ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ کرو''۔ (قرآن) یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے:

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

خاک یثرب جو مدینۃ الرسول اور روضۂ نبوی کی سرزمین ہے دونوں جہان سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے۔ کیا ہی عمدہ ہے وہ شہر جہاں محبوب خدا اور محبوب مسلمان آرام فرما ہیں۔ اس شہر کی یاد دلوں کو سکون اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اس یاد سے روح میں ایک ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔ صاحب مدینہ کی محبت ہی خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اور کائنات پر چھا جانے کا وسیلہ ہے۔ یہ انسان کی خودی کو محکم کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

خودی اور خودداری

خودی کے اثبات و اظہار کے لیے خودداری ایک ضروری شرط ہے، جس کی تکمیل کے بغیر نہ فرد کی خودی معتبر و موثر ہوسکتی ہے نہ جماعت کی۔ ناداری و محتاجی انسانی زندگی کے استقلال کو ختم کر دیتی ہے اور آدمی دوسروں کا دست نگر ہو کر جسمانی و ذہنی دونوں اعتبار سے مجبور ہو جاتا ہے۔ تنگ دستی سے تنگ دلی پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص دست سوال کسی دوسرے کے سامنے دراز کرتا ہے وہ اپنے کو ذلیل کرتا ہے۔ اس کی عزت

نفس باقی نہیں رہتی۔ اس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ وہ آزادی اور بہادری کے ساتھ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ وہ ایک بندۂ بے چارہ ہے اور دوسروں کی غلامی اس کے کردار کو غارت کردیتی ہے:

خستگی ہائے تو از نا داری است اصل درد تو ہمیں بیماری است
از سوال آشفتہ اجزائے خودی بے تجلی نخل سیناے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر از گدائی گدیہ گر نادار تر

زندگی کی جدوجہد میں ہماری درماندگی ناداری کے سبب ہے اور یہی ہمارے امراض کی جڑ ہے۔ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے خودی کے عناصر ترکیبی بکھر جاتے ہیں اور انسان جلوۂ حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ مانگنے سے غربت ذلت میں بدل جاتی ہے اور بھیک مانگنے والا پہلے سے زیادہ غریب ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر انحصار افلاس کو زیادہ سنگیں بنادیتا ہے۔ دریوزہ گری آدمی کی شخصیت پر ایک داغ لگادیتی ہے:

ماہ را روزی رسد از خوانِ مہر داغ بر دل دارد از احسان مہر

چاند کو سورج کے دسترخوان سے رزق ملتا ہے تو اس کے سینے پر دوسرے کے احسان کا دغ لگ جاتا ہے۔

یہ شخصیت کی تعمیر میں اقتصادیات کی اہمیت کا بیان ہے۔ معیشت کی درستگی کے بغیر کردار کی استواری نہیں حاصل ہوسکتی، خواہ کسی شخص کا معاملہ ہو یا پوری قوم کا۔ محنت معاشیات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ جو چیز اپنے دست و بازو سے حاصل ہو اسی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اپنی کمائی سے اعتماد نفس اور عزت نفس دونوں کی دولت ملتی ہے:

آں کہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رفت مرد کاسب را حبیب اللہ گفت

جس ذات اقدسؐ نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اس کا فرمان ہے کہ الکاسب حبیب اللّٰہ ''محنت کش اللہ سے محبت کرتا ہے''۔ محنت ہی انسان کو غیرت مند بناتی ہے۔ غیور انسان بہادر ہوتے ہیں اور بے غیرت بزدل:

چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

بلبلے کی طرح جواں مردی اور غیرت مندی کے ساتھ زندگی گزارو، وہ سمندر کے سینے پر اپنا پیمانہ الٹ رکھتا ہے تاکہ اس کی لہروں کا قطرہ بلبلے کے اندر نہ جائے۔

''سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں'' اقبال ہی کا مصرع ہے۔ محنت و کاوش سے زندگی کی تلخیاں شہد بن جاتی ہیں اور خودی کا فروغ ہموار طریقے پر ہوتا ہے۔

خودی کی قوت تسخیر

ایک خود شناس انسان خدا اور رسول کے ساتھ محبت کا رشتہ قائم کر کے اتنا طاقت ور ہو جاتا ہے کہ نظام عالم کی ظاہری مخفی قوتیں اس کی مسخر ہو جاتی ہیں۔ یہ قوت تسخیر بادشاہوں کے دل و دماغ بھی اپنے قابو میں کر لیتی ہے اور سلطنت کسی کی ہو، حکم خود آ گاہ عاشق رسول کا چلتا ہے۔ مرد فقیر کی ہیبت اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ ڈال دیتی ہے، سلاطین فقرا کی اطاعت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور فطرت بھی عارف کے اشارے پر چلتی ہے، پوری کائنات اس کے آگے سرنگوں ہو جاتی ہے:

از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرماں دہ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود ماہ از انگشت او شق می شود

جب خودی محبت سے محکم ہوتی ہے تو اس کی قوت پورے عالم پر فرماں روائی کرتی ہے۔ اس کا پنجہ خدا کا پنجہ ہو جاتا ہے اور اس کی ایک انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوتا ہے۔

''مسجد قرطبہ'' کا مشہور شعر ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

اس نکتے کو زیر نظر باب میں حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے ایک واقعے سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک باران کا مرید اپنے عارفانہ خیالات میں گم اپنی راہ پر چل رہا تھا کہ راستے میں عامل شہر کی سواری آ گئی۔ فقیر راستے سے نہیں ہٹا تو حاکم نے اس پر ڈنڈے برسا دیے۔ اس نے جا کر اپنے مرشد بوعلی سے شکایت کی۔ انھوں نے سلطان کو رقعہ لکھا کہ عامل کو فوراً معزول کر دو، ورنہ ملک تمہارے ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ سلطان نے فوراً تعمیل ارشاد کر کے قلندر صاحب سے معافی مانگی۔

نفی خودی کا منفی اثر

نفی خودی انسان اور اقوام کے اخلاق و کردار کو پست اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس کے منفی اثرات ایک بے چارگی اور خود شکستگی پیدا کرتے ہیں۔ اس کی ایجاد مغلوب قوموں کے احساس کمتری سے ہوتی ہے۔ یہ ایک فریب ہے جو اقوام غالب کو ناکارہ بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ عدم تشدد مجبوری و درماندگی کا فلسفہ ہے۔ قوت و شوکت سے محروم ہونے والے اس کا سہارا ایک حکمت عملی کے طور پر ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا مقصد تعمیری نہیں ہوتا اور نہ وہ کوئی اقدام کرتے ہیں، بلکہ وہ ایک تخریبی انداز سے پس پائی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک حکایت بیان کی گئی ہے جو نہایت عبرت انگیز ہے۔ ایک چراگاہ میں بکریوں

کا بہت بڑا ریوڑ رہتا تھا۔ اس میں شیر گھس آئے اور انھوں نے بے دریغ بکریوں کا شکار شروع کر دیا۔ ایک چالاک گوسفند نے جب دیکھا کہ بکریوں میں نہ تابِ مقابلہ ہے نہ ان کے لیے جائے پناہ تو وہ شیر ہی کے لیے ناصح مشفق بن گیا اور واعظ کا روپ دھار کر اس نے عدم تشدد اور سبزی خوری کا ایسا زبردست فلسفہ پیش کیا کہ شیر ذہنی طور پر مفلوج، قلبی طور پر بزدل اور عملی طور پر بالکل ناکارہ ہو گیا، اس کی ساری صلابت و شجاعت ختم ہوگئی، شان وشوکت جاتی رہی اور اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا:

آں جنوں کوشش کامل نہ ماند　　آں تقاضائے عمل در دل نہ ماند
اقتدار و عزم و استقلال رفت　　اعتبار و عزت و اقبال رفت
پنجہ ہائے آہنیں بے زور شد　　مردہ شد دلہا و تن ہا گورشد
زور تن کاہید و خوفِ جاں فزود　　خوفِ جاں سرمایۂ ہمت ربود
صد مرض پیدا شد از بے ہمتی　　کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی

بھرپور جدوجہد کا شوق نہ رہا، عمل کا تقاضا ختم ہو گیا، اقتدار عزم و استقلال رخصت ہو گئے، اعتبار وعزت و اقبال باقی نہ رہے، فولادی پنجوں کا زور ٹوٹ گیا، دل مردہ اور جسم لب گور ہو گیا، لاغری کے ساتھ ساتھ جان کا خوف پیدا ہو گیا اور ہمت پست ہوگئی، بزدلی نے سو امراض پیدا کیے، کوتاہ دستی، بے دلی، کمینگی کا غلبہ پیدا ہو گیا۔

یعنی خودی کے ان منفی وتخریبی اثرات کے باوجود شیر کو ہوش نہیں آیا اس کا شعور اس درجہ غارت ہوا کہ اس نے اپنے زوال کو تہذیب کا خوش نما نام دے دیا:

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

فلسفۂ یونان اور اسلام

افلاطون کے غیر حقیقت پسندانہ افکار نے ملت اسلامیہ کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اوپر کے قصے میں گوسفند نے شیر کے ساتھ کیا تھا۔ فلسفۂ یونان کا اثر جب عالم اسلام پر پڑا تو اس سے ذہن پراگندہ ہو گئے اور عمل مفلوج ہو گیا۔ افلاطون کے تصورِ عینیت ومثالیت نے زندگی کو ایک گورکھ دھندا اور خواب پریشاں بنا دیا۔ عقل پرستی اتنی بڑھی کے عالم اسباب تک نظر انداز ہو گیا، تخیل کی دنیا حقیقی دنیا سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی، یونانی فلسفے سے متاثر تصور ایک افیون بن گیا اور لوگ ایک سراب کے پیچھے دوڑنے لگے، مفید و مضر کے ساتھ ساتھ وجود وعدم کی تمیز بھی ختم ہوگئی، اپنی ہستی کی قوتوں پر سے اعتماد اٹھ گیا، رہبانیت طاری

ہوگئی، زندگی سے بے زاری اور موت سے الفت پیدا ہوئی، بے شعوری کے ساتھ بے کرداری آئی اور پوری تباہی کا سامان ہوا، انفرادی انتشار کے ساتھ ساتھ اجتماعی اضمحلال کے آثار نمایاں ہوئے:

فکر افلاطوں زیاں را سود گفت ہمت او بود را نابود گفت
فطرتش خوابید و خوابے آفرید چشم ہوش او سرابے آفرید
بسکہ از ذوق عمل محروم بود جان او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیان نامشہود گشت
زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است مردہ دل را عالم اعیاں خوش است
قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

مطلب یہ کہ فکر افلاطوں نے زیاں ہی کو سود بنا کر پیش کیا، اس کی حکمت نے ہستی کو نیستی میں بدل دیا، وہ خود بھی ایک خواب میں رہا اور دوسروں کے لیے بھی اس نے ایک خواب ناک فلسفہ تراشا، جو محض ایک سراب تھا، وہ ذوق عمل سے محروم اور دل دادۂ عدم تھا، اس نے ہنگامۂ وجود کا انکار کیا اور غیر موجود اعیان کی تخلیق کی، قومیں اس کے نشہ آور خیالات سے مسموم ہو کر غافل و ناکارہ ہوگئیں، لیکن عالمِ اعیان صرف مردہ دلوں کو پسند آ سکتا ہے، جب کہ زندہ دل عالم امکان کو اختیار کرتے اور اس میں دادِ عمل دیتے ہیں۔

ادب اور زوال خودی

اقبال کا خیال ہے کہ موجودہ مشرقی بالخصوص اسلامی اور ادبیات خودی کی روح سے خالی ہیں، اس لیے کہ عجمی فکر کے بے جا لطافتوں نے جمالیات کا ایک غلط نقطۂ نظر پیش کیا ہے، جو ادب و شعر میں رائج و راسخ ہو کر قارئین کے قوائے ذہنی کو مجروح اور قوائے عملی کو مفلوج کر رہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہوشیاری و سخت کوشی کے بجائے مدہوشی و تن آسانی پیدا ہو رہی ہے۔ استحکام ختم ہو کر اضمحلال نہ صرف شروع ہو گیا ہے بلکہ اپنی آخری حدوں کو پہنچ رہا ہے۔ نتیجتاً زندگی کی آرزو فنا ہو چکی ہے اور ترقی کا ولولہ سرد پڑ چکا ہے، عزائم خستہ اور حوصلے پست ہو چکے ہیں، ایک خواہش مرگ معاشرے پر غالب آ چکی ہے۔ اس تباہ کن صورت حال کی اصلاح اسی وقت ہوگی جب خودی کا شعور حاصل ہو اور اس کے مطابق کردار کی تعمیر کی جائے، فکر و عمل میں صلابت و حرکت پیدا ہو، پیکارِ حیات میں پوری قوت کے ساتھ شرکت کا حوصلہ ملے:

فکر روشن بیں عمل را رہبر است چوں درخش برق پیش از تندر است
فکر صالح در ادب می بایدت رجعتے سوئے عرب می بایدت
اندکے از گرمی صحرا بہ خور بادۂ دیرینہ از خرما بہ خور

خویش را بر ریگ سوزاں ہم بہ زن غوطہ اندر چشمۂ زمزم بہ زن

فکر روشن عمل کا راستہ دکھاتی ہے اور بجلی کی چمک رکھتی ہے، ادب میں فکر صالح کی ضرورت ہوتی ہے، اس مقصد کے لیے سوز عرب کی طرف رجوع کرنا ہوگا، تاکہ گلستان عجم کی خواب آور ہواؤں سے نکل کر ذرا گرمی صحرا اور تپشِ حیات کا بھی احساس ہو اور انگور کی نشہ آور شراب کے بجائے خرمے کا روح افزا عرق نوش کرنے کا موقع ملے۔ صحرا کی جلتی ہوئی ریت پر قدم بڑھا کر آب زمزم میں غوطے لگانا صحت بخش ہوگا۔

تب ہی فنکار اور دانش ور یا عام انسان زندگی کی معرکہ آرائی کے قابل ہوں گے اور ان کے جسم و جاں شعلۂ حیات سے روشن ہوسکیں گے:

تا شوی در خورد پیکارِ حیات
جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

تربیت خودی کے تین مراحل

اول اطاعت:

خودی خود سری یا خود پرستی نہیں ہے، بلکہ ایک اصول اور نصب العین کے تابع ہے۔ جس کی فرمانبرداری کر کے ہی یہ زندگی کے تعمیری مقاصد کی تکمیل کا سامان کرسکتی ہے۔ لہٰذا خودی کی تربیت کا سب سے پہلا مرحلہ اطاعت حق اور پابندی قانون ہے۔ اطاعت کے جبر سے ہی عمل کا اختیار پیدا ہوتا ہے، ایک آئین کی زنجیر میں بندھ کر ہی فضاؤں میں پرواز اور مہر و پرویں کا شکار کیا جاسکتا ہے، ستاروں کا اپنا سفر بھی ایک ضابطے کے مطابق ہے، سبزہ تک ایک قاعدۂ نمو پر اگتا ہے، قطرے چند اصول فطرت کی بنیاد پر مل کر دریا بنتے ہیں اور اسی طرح ذرے صحرا میں تبدیل ہوتے ہیں، ہر شے کی حقیقت ایک دستور پر مبنی ہے۔ لہٰذا قواعد و ضوابط کی سختی کا شکوہ کرنے کے بجائے حدودِ شریعت کے اندر زندگی گزارنے کی عادت ڈالنی چاہیے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار
ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند خویش را زنجیری آئیں کند
می زند اختر سوے منزل قدم پیش آئینے سر تسلیم خم
سبزہ بر دین نمو روئیدہ است پائمال از ترک آں گردیدہ است
قطرہ ہا دریاست از آئین وصل ذرہ با صحرا ست از آئین وصل
باطن ہر شے ز آئینے قوی تو چرا غافل ز ایں ساماں روی
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

دوم ضبط نفس:

نفس سرکش ہے اس کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ جو شخص اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتا وہ دوسروں کے قابو میں آ جاتا ہے۔ اپنے نفس کو صبر و ضبط کا پابند بنانے والا ہر قسم کے خوف اور لالچ سے آزاد ہو جاتا ہے، اللہ کے سوا کسی کا رعب اس کے دل پر نہیں پڑتا۔ لا الہ الا اللہ کا کلمہ اسے ایک ضابطۂ حیات اور نظام عمل پر کاربند کر دیتا ہے۔ اس نظام کے ارکان میں نماز ہے جو برائیوں سے روکتی ہے، روزہ ہے جو تن پروری پر پابندی لگاتا ہے، حج ہے جس سے ہجرت اور راہ خدا میں تکلیف اٹھانے کا سبق ملتا ہے، زکوۃ ہے جو مال کے حرص کو فنا کر کے مساوات کی تعلیم دیتی ہے، اس سے دولت بڑھتی اور دولت کی محبت کم ہوتی ہے:

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — می شود فرماں پذیر از دیگراں
تا عصائے لا الہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نہ گردد پیش باطل گردنش
خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

جب ضبط نفس سے انسان کے اندر یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا مقام اس طرح بلند ہوتا ہے کہ وہ ذات و کائنات دونوں پر غالب آ جاتا ہے:

اہل قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی

سوم نیابت الٰہی:

یہ آخری مرحلہ تربیت خودی کا ہے، جو دراصل خودی کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔ اطاعت اور ضبط نفس کے نتیجے ہی میں انسان خلافتِ الٰہیہ کے بلند ترین منصب پر سرفراز کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا میں ابن آدم کے ریاض کا ثمر اور اس کی سخت کوشیوں کا انعام ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و ریاضت کا مقصد ترک دنیا اور فنائے ذات نہیں، جیسا بعض صوفیہ نے سمجھ لیا ہے، بلکہ یہ مقصد تسخیر کائنات ہے:

کمالِ ترک نہیں، آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے، تسخیر خاکی و نوری

نیابت الٰہی سے سرفراز ہونے والا عناصر پر حکم رانی کرتا ہے، فطرت کی قوتیں اس کے لیے مسخر کر دی جاتی ہیں، وہ کائنات کے جز و کل سے واقف ہوتا ہے، تجدیدِ حیات کرتا ہے، تطہیر معاشرہ کرتا ہے، وہ نوع انسان کے لیے بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، یہ مقام پیمبر ہے جو سب سے بڑھ کر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوا۔ ذاتِ رسولؐ تعلیم اسماء سے بذریعہ وحی فیضیاب ہو کر سبحان اللہ الذی اسری کی

مشہور آیت کے مطابق معراج کی شب نظام کائنات کی آخری سرحد تک پہنچ گئی، جس سے عروج آدم خاکی کی انتہا کا اشارہ ملتا ہے۔ ذاتِ اقدس ؐ کو ید بیضا کی کرامت کے ساتھ ساتھ عصائے کلیمی کی طاقت بھی حاصل تھی۔ آپ ؐ نے عمل کی کلید سے مسائل حیات کے سارے قفل کھول کر رکھ دیے۔ حضور ؐ کی ذات پردۂ وجود پر ایک بار نمودار ہو کر دنیا سے پردہ کر چکی ہے، لیکن خیرالبشر اور مرد کامل نے اپنی سیرت کا جو نمونہ عالم انسانیت کے سامنے پیش کیا ہے اور ارتقائے انسانیت کا جو سنگ میل آپ ؐ نے ستاروں سے آگے نصب کر دیا ہے وہ ہمیشہ اولادِ آدم کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتا رہے گا۔ عصر حاضر اپنے مسائل کے حل اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے سیرت رسول ؐ کے نمونے پر ڈھلی ہوئی شخصیت ہی کا منتظر ہے۔ لہٰذا شاعر نے بڑے والہانہ انداز سے اس شخصیت کے رونما ہونے کی آرزو اور اس کا استقبال و خیر مقدم کیا ہے:

اے سوارِ اشہب دوراں بیا — اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورش اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشت گوش کن
خیز و قانونِ اخوت سازدہ — جام صہبائے محبت بازدہ
باز در عالم بیار ایام صلح — جنگجویاں را بدہ پیغام صلح
نوع انساں مزرع و تو حاصلی — کاروان زندگی را منزلی

اس عظیم شخصیت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انسانیت کے امکانات کی تکمیل کر لے گی اور اس کے انکشافات و ایجادات رونق حیات کو انتہائی حد تک بڑھا دیں گے، وہ شخصی جنگ کی ماری ہوئی دنیا کو امن کا پیغام دے گا اور تفرقہ و انتشار کو ختم کر کے اخوت و مساوات کی ترویج کرے گا، ہر طرف پھیلی ہوئی نفرت کو محبت سے بدل دے گا۔ یہ توقع ختم رسالت کے مضمرات و اثرات سے پیدا ہوتی ہے اور شاعر گویا ختم الرسل ؐ کے ظہور ثانی کی تمنا کر کے نیابت الٰہی کے ساتھ ساتھ ضبطِ نفس اور اطاعت یعنی تربیت خودی کے تینوں مراحل کی تکمیل کے لیے ایک نمونۂ کامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

واقعات، مثالیں، نصیحتیں

تصور خودی کے مفاہیم و مضمرات واضح کرنے کے بعد شاعر نے چند تاریخی واقعات، کچھ مثالیں اور بعض نصیحتیں عبرت و بصیرت کے لیے پیش کی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے اولیں وزریں عہد صحابہ سے اس نے خاص کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کی کنیت بلکہ خطاب ولقب، بوتراب کو لے کر اس کی بڑی فکر انگیز تشریح کی ہے۔ اس لفظ کا لغوی معنی خاکسار ہے، مگر اقبال نے اس کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے وہ اول تو یہ ہے کہ اپنی خاک کو خود قابو میں کیا جائے، تب یہی خاک اکسیر ہو جائے گی، دوسرے یہ کہ جس شخص نے اس

طرح تسخیر ذات کر لی وہ سنگ خارا کے مانند ٹھوس اور سخت ہو جاتا ہے اور چٹان بن کر نہ صرف حوادث کا مقابلہ بلکہ معاشرے کی تعمیر مضبوط بنیادوں پر کر سکتا ہے۔ یہی خودی کا راز اور اثر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس راز کی حامل تھی اور ان کے کارناموں نے وہ اثر دکھایا کہ ملت اسلامیہ کی تاریخ کے دورِ اول کے آخر میں فتنوں کے باوجود ملت کا شیرازہ برہم نہیں ہوا اور گرچہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ان کے بعد باقی نہیں رہی مگر اس کے نمونے کی استواری حضرت علیؓ کے عمل سے واضح ہو گئی۔ سیرت علیؓ کا یہ سبق یاد رکھنے کے قابل ہے:

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاج او بہ سازد روزگار
گر نہ سازد با مزاج او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیب نو ذرات را
گردش ایام را برہم زند — چرخ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوت خود آشکار — روزگار نو کہ باشد سازگار

مطلب یہ کہ ایک خود دار جواں مرد زمانے کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا، زمانہ اس کے ساتھ مصالحت کرتا ہے، وہ جواں مرد ناموافق دنیا سے لڑتا ہے، اپنے ماحول کو بدل کر ایک نیا ماحول پیدا کرتا ہے، گردش ایام کی پروا نہیں کرتا، اس کے پُر قوت عمل سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ باتیں حضرت علیؓ کے بے لچک کردار اور ان کی اٹل حق پسندی کی طرف اشارے کرتی ہیں۔ ان کی شہادت اس عالم میں ہوئی کہ وہ خلافت کے متعلق اپنے اصولی موقف پر قائم تھے۔ ان کی یہی صلابت و استواری بعد کے ادوار میں راہِ حق کے ہر مجاہد کو راستہ دکھاتی رہی اور اس کے سبب دنیا میں خلافت کی تجدید کے لیے متعدد اولوالعزم افراد سامنے آئے۔

حضرت شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر لاہور میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ حاضر ہوئے تھے۔ حکایت یوں ہے کہ مرو کے ایک نوجوان کو حضرت ہجویری نصیحت فرماتے ہیں:

مثل حیوان خوردن آسودن چہ سود — گر بہ خود محکم نہ بودن چہ سود
خویش را چوں از خودی محکم کنی — تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو — گر بقا خواہی بہ خود آباد شو
چیست مردن از خودی غافل شدن — تو چہ پنداری فراق جان و تن؟
در خودی کن صورت یوسف مقام — از اسیری تا شہنشاہی خرام
از خودی اندیش و مرد کار شو — مرد حق شو حامل اسرار شو

حیوان کی طرح کھانے اور آرام کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، اگر اپنی ذات محکم نہ ہو تو ہستی بے کار ہے، جو شخص خودی کی طاقت حاصل کر لیتا ہے وہ پوری دنیا کو زیر و زبر کر سکتا ہے، اپنے آپ سے بیگانہ ہو کر جینا موت ہے اور اپنے اندر آباد ہونا زندگی، جسم و جاں کی جدائی نہیں، خودی سے غفلت فنا ہے، خودی کی بدولت حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے قید خانے میں رہے تو پھر اس کے تخت اقتدار پر بھی فائز ہو گئے، خودی کے تصور کا علم بردار ہی دنیا میں کچھ کر دکھاتا اور زندگی کے بھید کھول دیتا ہے۔

قصہ ہے کہ ایک پرندہ پیاسا تھا۔ اسے ایک ہیرا مل گیا۔ اس نے اسے پانی سمجھ کر چونچ ماری تو اسے کھا نہ سکا۔ اس کے برخلاف شبنم کا ایک قطرہ خود بخود پرندے کے حلق میں ٹپک پڑا اور گھل گیا۔ اس سے درس ملتا ہے:

غافل از حفظِ خودی یک دم مشو ریزۂ الماس شو، شبنم مشو
پختہ فطرت صورتِ کہسار باش حامل صد ابر دریا بار باش
خویش را دریاب از ایجاب خویش سیم شو از بستن سیماب خویش
نغمۂ پیدا کن از تار خودی
آشکارا ساز اسرار خودی

اپنی خودی کی حفاظت سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے اور قطرۂ شبنم کے بجائے ریزہ الماس بننا چاہیے، کوہسار کی پختہ فطرت کو دیکھیے، اس کی چوٹیوں پر وہ بال منڈلاتے ہیں جن کے برسنے سے کتنے ہی دریا بہہ نکلتے ہیں۔ عرفانِ نفس اثبات ذات سے پیدا ہوتا ہے، پارہ جم کر چاندی بن جاتا ہے، تارِ خودی سے نغمہ نکالنا اور خودی کے راز آشکار کرنا چاہیے۔

ایک بار کوئلے اور ہیرے کے درمیان مکالمہ ہوا تو ہیرے نے بیان دیا:

فارغ از خوف و غم و وسواس باش پختہ مثل سنگ شو الماس باش
می شود ازوے دو عالم مستنیر ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشت خاکے اصل سنگ اسود است کو سر از جیب حرم بیرون زد است
رتبہ اش از طور بالاتر شد است بوسہ گاہ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است

اپنے دل سے خوف و غم و وسوسہ نکال دو اور پتھر کی طرح سخت ہو جاؤ تو ہیرا بن جاؤ گے، جو سخت کوش و سخت گیر ہوتا ہے اس سے دو عالم کو روشنی ملتی ہے۔ سنگ اسود بھی اصلاً ایک مشتِ خاک تھا، مگر ایک پتھر بن کر کعبہ کے اندر نصب ہو گیا اور اب اسے ہر رنگ و نسل کے انسان حج کے موقع پر بوسہ دیتے ہیں۔ زندگی کی آبرو

صلابت ہی میں ہے، ورنہ ناتوانی تو ایک ناکسی و ناپختگی اور بےعزتی ہے۔

حیات ملی و روایات ملی

یہ بھی نظریۂ خودی کا ایک پہلو ہے کہ کسی ملت کی مسلسل بقا اسی وقت ممکن ہے جب اس کی مخصوص روایات مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس نکتے کو ایک حکایت سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک برہمن نے بہت تپسیا کی تھی اور تلاش حق میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کی ملاقات ایک شیخ سے ہوئی تو انھوں نے اسے نصیحت کی کافر ہونے اور رہنے کے لیے بھی رشتۂ زنّار سے تعلق استوار کرنا پڑتا ہے اور اپنے آباؤ اجداد کے مسلک پر قائم رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدہ کوئی ہو، اس پر جم جانا اور اس کی تمام روایات کی پاس داری کرنا ہی جمعیت کا باعث ہوتا ہے، کفر بھی ہو تو کامل ہو، محکم ہو۔ محض نظریاتی فلسفہ طرازی کافی نہیں ہے۔ حقیقت پسندانہ عمل درکار ہے:

من نگویم از بتاں بیزار شو — کافری؟ شایستۂ زنار شو
اے امانت دار تہذیب کہن — پشت پا برمسلک آبا مزن
گر ز جمعیت حیات ملت است — کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم درکافری کامل نۂ — در خورِ طوفِ حریم دل نۂ

اسی طرح ایک بار گنگا اور ہمالہ کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے تو ہر وقت بہتی ہوئی گنگا کو چٹان بن کر اپنی جگہ صدیوں سے کھڑا ہمالہ بتاتا ہے:

زندگی بر جائے خود بالیدن است — از خیابانِ خودی گل چیدن است
ہستی بالید و تا گردوں رسید — زیر دامانم ثریا آرمید
ہستی تو بے نشاں در قلزم است — ذرۂ من سجدہ گاہِ انجم است
چشم من بینائے اسرار و فلک — آشنا گوشم ز پرواز ملک

یعنی زندگی اپنی جگہ پر ورش پانے اور خیابان خودی کے پھول چننے کا نام ہے۔ پہاڑ کی ہستی خودی کی اس پرورش سے اتنی بڑھی کہ آسمان تک پہنچ گئی اور ثریا جیسا بلند ستارہ اس کے دامن میں جگمگاتا نظر آیا، گنگا بہہ کر سمندر میں گر اور مل جاتی ہے، جب کہ ہمالہ کی چوٹی کو ستارے سجدہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، پہاڑ اسرار فلک کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کے کان فرشتوں کی پرواز سنتے ہیں۔

اسرار خودی کے تقریباً آخر میں ملی حیات و روایات کا ذکر رموز بیخودی کی تمہید ہے۔ خودی کے مراحل میں اطاعت اور ضبط نفس کے ساتھ ساتھ ملت کی جمعیت کی طرف اشارہ اقبال کی نظریۂ خودی میں توازن اور جامعیت پر ایک تاکیدی نشان لگاتا ہے۔ اسی طرح خودی میں جو عمل کا عنصر ہے وہ بالآخر

جہاد تک پہنچتا ہے، جو عمل کا بہترین نمونہ ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ حق وصداقت اور عدل وانصاف کے لیے ہو، ملک گیری اور اقتدار پرستی یا خون ریزی وغارت گری کے لیے نہیں۔ چنانچہ اگلا بیان حکمت جہاد کے متعلق ہے۔

جہاد

جہاد ایک شرعی اصطلاح ہے۔ راہِ حق کی ہر جدوجہد ایک جہاد ہے۔ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ زبان وقلم، درم وقدم سے اور ضرورت ہو تو ہتھیار اٹھا کر دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنے یا اسلام کے تحفظ وترقی کے لیے ہر ممکن سعی کرے۔ ایک جملے میں حق کے لیے اور باطل کے خلاف بلیغ کوشش کا نام اصطلاحی طور پر جہاد ہے۔ خودی کے اثبات واظہار کا ایک مرحلہ وموقع جہاد بھی ہے بلکہ خودی کا ہر وہ عمل جو خدا کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے وسیع تر معنوں میں ایک جہاد ہے۔ لیکن جہاد کے پردے میں کسی ظلم وستم کی اجازت نہیں دی جاسکتی، خودغرض اور مفاد پرستی جہاد میں روا نہیں، کسی قسم کی خالص دنیوی منفعت نہ تو جہاد کی محرک ہوسکتی ہے نہ مقصود۔ ایک حدیث کے مطابق ظالم حکمران کے مقابلے میں حق کا کلمہ بلند کرنا سب سے بڑا جہاد ہے، اس لیے کہ دوسری حدیث کی رو سے ایمان کا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکا جائے، جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرآن حکیم نے امت مسلمہ کا مقصد وجود اور فریضۂ شرعی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور انھیں بدی سے روکنے کے لیے طاقت کے استعمال کی ضرورت بھی ہوسکتی ہے اور جب یہ استعمال ناگزیر ہو جائے تو ہرگز اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ عدم تشدد نہ تو اسلام کا عقیدہ ہے نہ فطرت انسانی کے مطابق ہے اور انتہائی عدم تشدد کا پرچار کرنے والے بھی انفرادی واجتماعی زندگی کے متعدد امور میں تشدد سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو حکومت یا معاشرہ مجرموں اور فتنہ پردازوں کے ساتھ نرمی کرے گا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ امن کے قیام کے لیے بدامنی پر روک لگانے کی اہمیت معلوم ہے۔ کائنات رزم خیر وشر کا میدان ہے۔ لہٰذا شر کے توڑ اور خیر کے فروغ کے لیے تدبیر کرنی ہوگی۔ حق وناحق کے مقابلے میں کوئی غیرت مند انسان غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ اسے حق کی طرف داری کرنی ہی ہے، خواہ وہ فطرت سے پُر ہو۔ فطرت لہو ترنگ ہے، جل ترنگ نہیں، لہٰذا زورِ دست وضربت کاری سے کام لینا ہوگا، یہ زندگی کے سنگین حقائق کا تقاضا ہے، جس کی تکمیل خودی کی قوت شوکت کا ثبوت ہے۔ نرم کے ساتھ نرمی اور درشت کے ساتھ درشتی کے بغیر روئے زمین پر کوئی نظام نہ قائم ہوسکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے۔ جلال کے بغیر جمال بے تاثیر ہے۔

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک بار جنگ کے دوران جب بادشاہ وقت ان کی دعا

لینے گیا تو انھوں نے اسے بہت نصیحت کی اور عبرت دلائی، ایک طرف تو اسلامی جہاد کی حکمت بتائی اور کہا کہ کلمۂ لا الہ الا اللہ اور آیت صبغۃ اللہ کی شان جہاد سے آشکار ہوتی ہے، لیکن دوسری طرف اسے سخت تنبیہ بھی کی کہ جوع الارض میں مبتلا نہ ہو اور دولت وسطوت کے لیے سماج کو فتنے میں نہ ڈالے، اس لیے کہ جو فوج کشی اور لشکر آرائی مال غنیمت اور کشور کشائی کے لیے کی جاتی ہے وہ نہ صرف ملک وملت کو فنا کر دیتی ہے بلکہ جنگ باز کے لیے بھی خودکشی کا پیغام لاتی ہے:

صلح شر گردد چو مقصود است غیر — گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
گر نہ گردد حق ز تیغ ما بلند — جنگ باشد قوم را ناارجمند
آتش جان گدا جوع گداست — جوع سلطان ملک وملت را فناست
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

ملت کی خودی کا انحطاط

ملت اسلامیہ تاریخ انسانی میں خودی کا سب سے عظیم نمونہ ہے، مگر یہ اپنا پیغام فراموش کر چکی ہے اور اس کا کردار بگڑ چکا ہے۔ امت مسلمہ کے اس زوال وانتشار پر ایک صاحب دل صوفی، میر نجات نقش بند المعروف بہ بابائے صحرائی ہندوستان کے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں:

از خودی مگذر بقا انجام باش — قطرۂ می باش و بحر آشام باش
تو کہ از نورِ خودی تابندۂ — گر خودی محکم کنی پایندۂ
دانش حاضر حجاب اکبر است — بت پرست وبت فروش وبت گراست
پا بہ زندان مظاہر بستۂ — از حدود حس بروں ناجستۂ
اے امین حکمت ام الکتاب — وحدت گم گشتۂ خود بازیاب
ما کہ دربان حصار ملتیم — کافر از ترک شعار ملتیم
دل ز نقش لا الٰہ بیگانۂ — از صنم ہائے ہوس بت خانۂ

چند اشعار میں ملت کے اصل مرض کی تشخیص کی گئی ہے۔ سب سے پہلے بتایا گیا ہے کہ بقا اسی کو نصیب ہوتی ہے جو خودی کی نگہداشت کرتا ہے، اگر خودی سلامت ہے تو قطرہ سمندر میں فنا ہونے کے بجائے سمندر کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، مسلمانوں کی ساری آب وتاب خودی کی روشنی سے ہے ان کا استقلال و استحکام اسی وقت تک ہے جب تک ان کی خودی محکم ہے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ دانش حاضر مسلمانوں

کے لیے حجاب اکبر بن گئی ہے، جدید علوم کی ظاہری چمک دمک ان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہے، انھیں ایک نئے انداز کی بت پرستی سکھا رہی ہے، خرد کے نظریات مظاہر پرستی پر مبنی ہیں اور ان کی رسائی حواس ظاہری تک محدود ہے، چنانچہ آج کے مسلمان مادہ پرستی کے سطحی جلوؤں میں گم ہو رہے ہیں اور اپنی حقیقت نیز حقائق حیات کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے حکیمانہ نکات کو بھول کر وہ تفرقہ و انتشار میں مبتلا ہو گئے ہیں، انھوں نے شعارِ ملت چھوڑ دیا ہے اور قصر ملت کی پاسبانی سے قاصر ہو رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل نقش لا الہ سے بیگانہ ہو چکے ہیں اور صنم ہائے ہوس کا بت خانہ بنے ہوئے ہیں۔ اس بیان میں دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے۔

وقت اور تقدیر

فلسفۂ خودی کے سلسلے میں وقت اقبال کا ایک اہم موضوع ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی تقدیر پرستی میں مبتلا ہو کر مسلمان اپنی اصلاح سے غافل ہو رہے ہیں اور نشاۃ ثانیہ کی فکر نہیں کر رہے۔ لہٰذا اقبال نے بہت زور و شور سے فلسفۂ زمان اور تصورِ تقدیر کی غلط تعبیروں پر سخت ترین تنقیدیں کیں اور لوگوں کو وقت و تقدیر کے صحیح تصور پر غور و فکر کی دعوت دی۔ انھوں نے بتایا کہ خدا کی مشیت اس کی مدد کرتی ہے جو اس کے احکام بجا لاتا ہے اور اس کے مقررہ کردہ قوانین فطرت کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی خودی کا عرفان اور اس کی روشنی میں عمل وقت اور تقدیر کے سارے مسائل حل کر سکتا ہے:

تا کجا در روز و شب باشی اسیر　　رمز وقت از لی مع اللہ یاد گیر
وقت را مثل مکاں گستردۂ　　امتیازِ دوش و فردا کردۂ
زندگی از دہر و دہر از زندگی است　　لا تسبوا الدھر فرمان نبی است
عبد را ایام زنجیر است و بس　　بر لب او حرفِ تقدیر است و بس
ہمت حُر با قضا گردد مشیر　　حادثات از دست او صورت پزیر
رفتہ و آیندہ در موجود او　　دیر ہا آسودہ اندر زودِ او
نغمۂ خاموش دارد ساز وقت　　غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت
اعتبار از لا الہ داریم ما　　ہر دو عالم را نگہ داریم ما
از غم امروز و فردا رستہ ایم　　با کسے عہد محبت بستہ ایم

ذات ما آئینہ ذاتِ حق است
ہستی مسلم ز آیاتِ حق است

مطلب یہ کہ تم روز وشب کے کب تک اسیر رہو گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو یاد کرو کہ ''میرے لیے اللہ کے ساتھ ایک وقت ہے'' تم نے زمانے کو مکان کی طرح بچھا لیا ہے اور گزشتہ و آئندہ لمحات کے درمیان فرق کرتے ہو، زندگی اور دہر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا فرمان ہے کہ ''زمانے کو برا نہ کہو، اللہ ہی زمانہ ہے''۔ گردش ایام کے پابند غلام ہوا کرتے ہیں اور وہ ہر وقت تقدیر کی دہائی دیتے رہتے ہیں، جب کہ آزاد انسان مشیت الٰہی کے مطابق دلیری سے زندگی گزارتے ہیں اور زمانے کے حوادث ان کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں، ماضی و حال دونوں آزاد انسان کے زمانۂ حال میں شامل ہوتے ہیں، وقت تو ایک نغمۂ خاموش ہے، اس کا راز جاننے کے لیے اپنے دل کی گہرائیوں میں غوطہ لگانا چاہیے، دنیا میں مسلمانوں کا اعتبار لا الہ الا اللہ کے کلمے سے ہے اور اسی دولت توحید کے طفیل انھیں کائنات کا نگراں بنایا گیا ہے، خدا اور رسول کی محبت میں سرشار ہو کر مسلمان امروز وفردا کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں، مسلمان کا کردار ذاتِ حق کا آئینہ ہے اور ہستی مسلم ایک آیت حق ہے۔